سید محمد ذوالکفل شہیدؒ

بنت بستانِ عائشہ

خالق ارض وسما نے روز اوّل سے ہی اپنے سوا کائنات کی ہر چیز کے لیے فنا کا اصول مقرر فرما دیا۔ سیدنا آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والی ہر جان نے موت کا جام پینا ہے۔

دو سال قبل ۱۵ر نومبر ۲۰۰۹ء کی وہ غمگین شام نا قابل فراموش ہے۔ جس نے چند لمحوں میں قیامت صغریٰ برپا کر دی تھی۔ ہم تو اس سے بے خبر معمولات یومیہ میں مشغول رہے۔ مغرب کے وقت اطلاع موصول ہوئی کہ مکرم، منعم کے بابا جان کار حادثہ کے نتیجے میں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں ہیں۔ میرے خدایا خبر تھی کہ صاعقۂ سماوی۔ پھر کچھ نا سمجھی کے عالم میں کبیدہ خاطر اللہ تعالیٰ سے ان کی زندگی کے لیے استدعا کی مگر انسان کی سوچ و خواہش فائق و ماورا نظامِ کائنات غالب رہا۔ موت کا دست غیر مرئی ہمارے درمیان سے یہ کالا گلاب لے اڑا یعنی ذوالکفل شاہ جیؒ نے دنیائے دنی سے تمام تعلق چھڑا کے رب ذوالمنن سے نفس مطمئنہ کا مژدہ وصول کر لیا۔

تمام رات مرغ بسمل کی طرح تڑپتے ہوئے اس خبر کی تکذیب میں گزری لیکن اگلی صبح کے اخبار نے توثیق کر دی۔ آنسوؤں کا سیلِ رواں ضبط کے تمام بندھن توڑ کے پلکوں کی باڑ پھلانگ گیا۔ اسی غمناک کیفیت میں غلطاں و پیچاں دارِ بنی ہاشم پہنچی تو یوں لگ رہا تھا کہ دنیا کی ہر چیز اس سانحے پر اداسی کا لبادہ اوڑھے چپ چاپ کھڑی ہے۔ اپنے، پرائے، مرد و زن سبھی ذوالکفل شاہ جیؒ کی عالمِ آب و گل سے روانگی پر اشک بار تھے، لیکن افراد خانہ کا صبر جمیل فقید النظیر تھا۔ ہر لمحہ تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھتا چلا جا رہا تھا اور وہ سب تو کمال ضبط سے دوسروں کی اشک شوئی کر رہے تھے۔ آنسو بہتے تو آنکھیں ''تفیض من الدمع'' کا مصداق بن جاتیں اور جب رکتے تو لگتا جیسے دجلہ و فرات کا پانی روکے ہوئے ہیں۔

تیری جدائی میں مرنے والے وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تیری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ کسی کی قدر و منزلت کا اندازہ اس کا جنازہ دیکھ کر ہوتا ہے، اس روز مجھے اس بات پر عین الیقین، حق الیقین ہوا، جب یہاں تقریباً نو بجے اطلاع پہنچی کہ حرمِ کعبہ میں لاکھوں زائرین حج نے سبطِ امیر شریعتؒ کی نماز جنازہ ادا کی ہے اور جنت المعلیٰ میں مونسۂ امت حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قدمین شریفین میں ان کا مستودع بنا ہے۔

ذوالکفل شاہ جیؒ کیا تھے؟ اسے لفظوں کا پیرہن دینا کیونکر ممکن ہوگا؟ اور ویسے بھی ''انگلیاں فگار اپنی خامہ خونچکاں اپنا'' وہ تو ہمہ جہت صفات سے متصف تھے۔ سراپا علم وادب، خلوص وحیا کا پیکر، علم وعمل کا امتزاج، متبسم چہرہ، مسکراہٹوں کے قاسم، ذی غض بصر، وسیع النظر، عمیق الفکر، دقیق الفہم۔ غرضیکہ ان کی عبقریت کا اندازہ لگانا ذرا مشکل ہے۔

اثر جون پوری کے چند اشعار ان کے لیے

انہیں چشم ڈھونڈے ہے ہر طرف وہ نظر میں ایسے سما گئے
سبھی اہلِ دل ہیں دریدہ دل وہ جہان فانی سے کیا گئے
یہاں رند ہیں سبھی تشنہ لب، یہاں ہر مریض جاں بلب
وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے
وہ سلف کی گویا شبیہ تھے، وہ زمانے بھر کے فقیہ تھے
وہ جمیل تھے وہ وجیہ تھے، سو دلوں پہ نقش جما گئے
اے اثر انہوں نے حیات کا کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا
جو خدا سے عہد الست تھا وہ بہ حسن و خوبی نبھا گئے

نظم ونثر دونوں ہی گہر ہائے آبدار ہوتے تھے۔ جامع تحریر، پر اثر کلام، مافی الضمیر بیان کرنے پر قدرت، بحور و اوزان، تقطیع، تلمیح، تشبیہ واستعارہ وغیرہ کیا خوب تھے۔ قاری لحہ بہ لحہ زیادہ چاشنی محسوس کرتا۔ ڈوبتے سورج کے لیے نوید سحر، ظلمت کے خلاف آواز حق، گرداب میں پھنسی کشتی کی ساحل کی طرف رہنمائی، یہ سب کچھ کیسے کرنا ہے وہ بدرجہ اتم جانتے تھے ان کی صریر خامہ بامقصد ادبیت کے ایوان میں ہمیشہ گونجتی رہے گی۔

تقریر میں تو گویا لسان الاثر تھے۔ یوں لگتا جیسے موتیوں کی مالا ٹوٹ گئی ہو۔ باطل کے لیے قدغن، للکار حق شناسی، حق گو، فصاحت وبلاغت اتنی کہ ہر غبی وذکی ذہن ان کی بات سمجھ لیتا اور سر دھنتا۔ ان کی لاجورد گفتگو لاف زنی سے پاک ہوتی۔

کتھا نہیں ہے یارو خون جگر ہے میرا

ان سے لقاء کی خاطر احباب کی کیفیت شعلۂ جوالہ کی سی ہوتی جو کوئی ایک بار ملتا اس کا مرحوم سے تعلق لاینفکّ قائم ہوجاتا۔ ملنے والے کواکب کی تعداد میں تھے۔ ہر کوئی طفولت وکہولت، ناتراشیدگی وتبحر علمی کی تمام قیود سے آزاد ہوکر بلا تخصیص وتعمیم اس عین جاری سے اکتساب کرتا۔ متفرقات واشتات میں سے چاہے کچھ بھی استفسار کریں یہ مردِ لبیب لبالب بھرے ہوتے تھے۔

یادایام میں سے ایک واقعہ رقم کرتی ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ذوالکفل شاہ جیؒ ایک مقامی کالج میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ کالج میں ایک تقریب منعقد ہورہی تھی، لغوخرافات جس کالابدی جز تھیں۔ شاہ جیؒ کے ذمہ فرائض نظامت تھے۔ ایک بانکا، سجیلا نوجوان بھی اس تقریب میں شامل ہوگیا۔ اتفاق بالاتفاق کہ اس کی بہن جامعہ ہٰذا میں زیرِتعلیم تھی۔ اس نے اپنی بہن کے سامنے شاہ جیؒ کی اس تقریب میں شمولیت پر کوئی اعتراض کیا ہوگا کہ اگلے دن اس طالبہ نے (جواب فارغ التحصیل ہیں) بھری جماعت میں بڑی باجی سے کہا: دریں شک است۔ بڑی باجی نے کہا: دیکھو بھئی غلط تو غلط ہے چاہے میرا بھائی ہی کیوں نہ کرے۔ بہرحال! کل بات ہوگی۔ گھر جاے جب بڑی باجی نے معمولی سے خفگی کے ساتھ یہ بات ان کے سامنے رکھی تو شاہ جیؒ نے سب سے پہلے ان تہنیت پیش کی کہ آپ نے اپنی بچیوں کو صحیح غلط بابانگ دہل کہہ دینے کا حق دیا ہوا ہے اور پھر کہنے لگے: ''میں بالجزم کہتا ہوں کہ معترض ہمارے کالج کا رکن نہیں ہے۔ اگر وہ ہوتا تو اسے یہ معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس تقریب میں میری شرکت ضروری تھی۔ تاہم میں نے نعت و تلاوت کے بعد اسٹیج چھوڑ دیا تھا بلکہ وقتاً فوقتاً حق بات کہہ چھوڑی اور تقریب کو k.k کا نام دیا۔'' تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ وہ نوجوان واقعی کالج کا طالب علم نہیں تھا۔

بڑی باجی نے اپنے صوفی منش بھائی کے بارے میں مزید بتایا کہ وہ زمانۂ طالب علمی میں بھی سر پر مخصوص ٹوپی اور پیروں میں ہوائی چپل پہنتے تھے۔ کچھ افراد کو اس پر اعتراض ہوا لیکن ان کی جرأت رندانہ اور ثقہ علی النفس کے سامنے ان کی ایک نہ چلی اور وہ اپنا سامنہ لے کے رہ گئے۔

شام بھی تھی دھواں دھوں، حسن بھی تھا اداس اداس
دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

مجھے یقین ہے کہ وہ جب اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچے ہوں گے تو حورانِ جنت اور ملائک نے ان کا استقبال کیا ہوگا اور اللہ نے انھیں ''زلفیٰ'' مقام بھی عطا کیا ہو لیکن دنیا میں ان کی دو معصوم کلیاں جو ابھی تک اس تعویق پر حیران و پریشان ہیں۔ یکلخت اپنی چھت اڑ جانے سے ان کی کیفیت اس شخص کی مانند ہے جس کا ابرِ نیساں گم ہوگیا ہو۔ بقول منیر نیازی:

میرے بابا......میرے بابا، تم کہاں جا رہے ہو؟
خدا کے لیے اتنا تیز نہ چلو
بات کرو، میرے بابا! اپنے ننھے بچے سے کوئی بات کرو
نہیں تو میں گم ہو جاؤں گا......اور پھر دھند اڑ گئی بہت دور

عربی میں ایک مقولہ ہے کہ ''الولد سرٌّ لأبیه'' ایسے ہی دونوں کے انداز و افکار ہو بہو اپنے والد جیسے ہیں۔

درّ ابلق سید عطاء المکرّم انتہائی حساس اور پیار محبت والا بچہ ہے۔ پہلے بہن اور پھر بابا جان کی موت نے اس کے ننھے ذہن میں کئی سوال اٹھا دیے ہیں۔ ہر صیغہ سے موت کے بارے میں پوچھ چکا ہے۔ ابتدا میں اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ جوتا، عینک، گھڑی، قلم، کتاب، ہر چیز کی نسبت سے اپنے بابا جان کے واقعات سناتا رہتا تھا اور اب تک ایسا کرتا ہے۔ ایک دن مجھ سے یک دم کہنے لگا: ''جب سب نے مل کے بابا جان کو قبر میں اتارا تو کھڑکی کیوں نہیں رکھی ان کا تو دم گھٹ جائے گا۔'' اس لمحے مجھے اپنا دم نکلتا ہوا محسوس ہوا۔ میں کچھ توقف کے بعد بولی: دیکھو چندا آپ وہاں تمام وقت تو موجود نہیں رہے ہو۔ جیسے ہی سب انہیں دفن کر کے آئے تو فرشتے انہیں وہاں سے نکال کر جنت میں لے گئے۔

درّ شہوار سید عطاء المنعم بڑا متدبر اور سطوت والا بچہ ہے اکثر مجھے اپنے عزائم سے آگاہ کرتا رہتا ہے کہ مجھے بڑے ہو کر مساجد بنوانی ہیں، تقاریر کرنی ہیں، کفر کو ختم کرنا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اسی وجہ سے میں یہ مثل سمجھی ہوں کہ ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔''

ایک دن باتوں ہی باتوں میں میں نے کہا: آپ بڑے ہو کر مفتی بننا۔ فوراً بولا: جی باجی! میں بڑے ہو کر مفتی بنوں گا، سب کو مفت ہی چیزیں دوں گا۔'' میرا تو ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے گھوم رہا تھا لیکن یہ زخم تو اب عالم ارواح میں پہنچ کر ہی مندمل ہوگا۔ معلوم ہوا کہ دنیا مکڑی کا جالا ہے اور اس کی نیرنگیاں ایک دھوکہ

یا صاحبی لا تغتر ربا لتنعم　　　فالعمر ینفد والنعیم یزول
واذا حملت الی القبور جنازہ　　　فاعلم بانک بعدھا محمول